پروفیسر خلیق احمد نظامی

مُستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور
طریقہ کار کا تجزیہ اور اصلاحِ حال کی راہ

[آج برصغیر پاکستان و ہند اور بالخصوص تاریخ عہد وسطیٰ پر جن چند افراد کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے، ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی (۱۹۲۵ء-) شامل ہیں۔ پروفیسر صاحب امروہہ (یو۔پی) کے تاریخی قصبے کے ایک نامور علمی و دینی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماضی قریب کے نامور صاحبِ قلم مولانا نسیم احمد فریدی اُن کے ماموں تھے اور "حضرت مجدّد کا نظریۂ توحید" کے مصنّف ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اُن کے قریبی عزیزوں میں شامل ہیں۔

پروفیسر نظامی صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب کا پہلے شاگرد اور پھر رفیق کار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ ہوئے، شعبۂ تاریخ کے ریڈر، پرووائس چانسلر اور پھر وائس چانسلر کے منصب پر فائز رہ کر ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۷ء کے درمیان حکومت ہند کی جانب سے شام میں بطور سفیر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر صاحب ہندوستان اور مغربی دُنیا کے کئی علمی اور تحقیقی اداروں سے وابستہ ہیں۔ اُنہوں نے اُردو اور انگریزی میں متعدّد کتابوں کے ساتھ پچاس سے زائد علمی و تحقیقی مضامین لکھے ہیں جو بلند پایہ جرائد، مجموعہ ہائے مقالات یا انسائیکلوپیڈیا طرز کی کتب مراجع میں شامل ہیں۔ ذیل میں پروفیسر صاحب کی چند بہت ہی معروف اُردو کتابوں کے نام دیے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ مشائخ چشت (۱۹۵۳ء)
۲۔ حیات شیخ عبدالحق محدّث دہلوی (۱۹۵۳ء)
۳۔ ترتیب و تدوین "خیر المجالس" (۱۹۵۵ء)
۴۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ (۱۹۵۵ء)
۵۔ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات (۱۹۵۸ء)
۶۔ تاریخی مقالات (۱۹۶۶ء)
۷۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (۱۹۶۹ء)

پروفیسر نظامی صاحب کو تحقیق و تالیف کے دوران میں مستشرقین کے اندازِ تحقیق کا گہری نظر

سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ برصغیر کی تاریخ کے حوالے سے انہوں نے مستشرقین کی "خدمات" کا جائزہ لیا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ پروفیسر صاحب نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے زیرِ اہتمام ایک سیمینار میں پیش کیا تھا جو ماہنامہ "معارف" کے شکریے کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ مقالے کے حواشی دوسری قسط کے ساتھ "عالمِ اسلام اور عیسائیت" کی روایت کے مطابق آخر میں شائع ہوں گے۔ کوشش کی گئی ہے کہ تمام کتب حوالہ کے بارے میں بنیادی معلومات مہیّا کر دی جائیں۔ مدیر]

ہر قوم کی حیات اجتماعی کی ایک روح ہوتی ہے، جس کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی تاریخ یا تمدن کی بنیادی حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں، مستشرقین نے اسلام کی تاریخ اور تہذیب کی تحقیق میں مہتم بالشان کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر اس کی داخلی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، اس ناکامی کے اسباب کی توجیہ اس وقت ممکن ہے جب ان عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا جائے جن کے زیر اثر مستشرقین نے تاریخِ اسلام پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی اور اس کے مذہبی افکار اور تمدنی اداروں کی نوعیت کو سمجھنا چاہا تھا، یہ محرکات کبھی مذہبی عصبیت کا سہارا لیتے تھے، کبھی مقتضائے سیاست سے ان کا رخ متعین ہوتا تھا، کبھی معاشی دُور اندیشی، علمی جدوجہد کا پیکر اختیار کر لیتی تھی۔ مذہب، سیاست اور معاشیات کی اس تگ و دو میں خالص علمی اور تحقیقی کاوشوں کی کیفیت گریز پا نظاروں کی سی رہتی تھی۔ اگر تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو مستشرقین کی تحقیقی جدوجہد کے پانچ دور سامنے آئیں گے۔

پہلا دور

اسلام اور اس کے تہذیبی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ مغرب میں اس وقت بیدار ہوا تھا، جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا تھا، یہ صرف ایک ملک یا ایک جزیرہ کی فتح نہ تھی، بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آفریں دور کا آغاز تھا، ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر میسی نیون 'تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا، اور مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے امکانات پیدا کر دیے، عربوں کے علوم کو حاصل کرنے، ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے، اور ان کی علمی سر بلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے، عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات، نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور گو پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق جب گفتگو کرتے تو اپنے متعصبانہ جذبات کو چھپا نہ پاتے تھے، لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریعے علمی سر بلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی۔ ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کے ایک فاضل ڈریمونڈ نے

ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کے لیے قائم کیا، اس محکمہ میں بہت سے یہودی عالم شامل تھے۔ ۱۱۵۸ء میں طلیطلہ ہی کا ایک یہودی عالم ابراہیم بن عذراء انگلستان پہنچا اور علوم اسلامی کے مطالعہ کی ضرورت اور افادیت پر توجہ دلائی۔ اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں نے جن کی زبان عبرانی تھی، عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل کی، اور عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا، گیرارڈی کریمونا (م ۱۱۸۷ء) (Gerarddi Crimona) نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درس گاہوں میں تحصیلِ علم کے لیے آنے شروع ہوئے، بارہویں صدی کے ان علماء میں ایڈیلرڈ (Adelard) کا نام خاص طور قابل ذکر ہے۔ اس نے انگلستان میں نہ صرف عربی علوم کی حمایت میں بہت کچھ لکھا، بلکہ متعدد عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ڈینیل آف مارلے (Daniel of Marley) نے اسپین پہنچ کر عربوں کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی، میکل اسکاٹ (Michael Scott) نے سسلی میں اسلامی علوم کی تحصیل کی، اور پھر ارسطو کی تصانیف کا عربی سے ترجمہ کرنے میں عمر گزار دی، کلیسیا نے بھی عربی علوم کی افادیت کو محسوس کیا، اور پوپ جان (Pope John) نے ۱۳۲۵ء میں ایک منشور کے ذریعہ اپنے نمائندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبہ کی نگرانی میں غفلت نہ برتی جائے۔

ایڈیلرڈ نے اپنی کتاب مسائل طبیعیہ (Natural Questions) میں عربوں کے اُس احسان کا بھی ذکر کیا ہے، جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی، عربوں نے یورپ کو اس حقیقت سے آگاہ بھی کیا کہ عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح حاصل ہے، یورپ کا دور احیائے علوم (Renaissance) اسی اصول کا شرمندۂ احسان تھا۔[۲] آنے والی صدیوں میں اسی پر عمل پیرا ہو کر یورپ نے علمی دنیا کی سربراہی کا راز پایا، اور وہ عظیم الشان علمی کارنامے انجام دیے، جنھوں نے اس کو علمی فضیلت کی صفِ اول میں پہنچا دیا، اقبال نے اسی دور کے عربوں کے کارناموں کے پیش نظر کہا ہے۔[۳]

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دستِ ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند

دوسرا دور

مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کی ابتداء صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے، گو کہ بعض

مستشرقین جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، صلیبی جنگوں کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی علمی جدو جہد کا مرکز اسلام نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کے وہ علوم و فنون تھے، جن کے حصول میں انھوں نے کسی تعصب کو قریب نہیں آنے دیا، مولانا شبلی نے اس دور کے مستشرقین کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔[۴]

> یورپ کی فیاضی دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک تو مذہبی اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ ربائی شروع کر دی۔

لیکن اس فیاضی کا تعلق غیر مذہبی لٹریچر سے تھا، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، صلیبی جنگ کے بعد مستشرقین کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں بنیادی تبدیلی رونما ہو گئی۔ اب اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا، جو ان کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آگیا ہو، انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کا رخ اسلام کو غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، اس لیے کہ اسی میں ان کو عیسائیت کی مدافعت کی راہ نظر آتی تھی۔ کتنے ہی غلط اور بے بنیاد الزام تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اس دور میں تراشے گئے، اور ان کو شہرت عام دے دی گئی۔ حضرت عمرؓ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا حکم اسی زمانہ میں مستشرقین نے وضع کیا اور اس کو اس طرح مشہور کیا کہ اپنے پرائے سب کو اس کی صداقت پر یقین آگیا۔ اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے ان کے متعلق گمراہ کن خیالات کو قومی گیتوں میں اس طرح سمو دیا کہ یہ جنگی معرکوں میں رجز کے طور پر گائے جانے لگے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کسی شخص کو عیسائی بنایا جاتا تھا، تو یہ خیالات عقائد کے طور پر اس کو سکھائے جاتے تھے۔

مستشرقین نے اسلام کی جو غلط تصویر اس دور میں پیش کر دی تھی، وہ مدتوں تک یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہی۔

تیسرا دور

مستشرقین کی علمی جدو جہد کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا، جب صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا، اب "یورپین اقوام" نے مسلمان ملکوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنا شروع کر دیں۔ ان حالات میں اسلام کی طرف کھلا عناد سیاسی مصالح کے منافی نظر آنے لگا۔ ان ملکوں پر اقتدار کے مضبوط پنجے جمانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک پیچ و خم، ان کے افکار و احساسات کی ایک ایک خلش، اور ان کے سماجی رجحانات اور دینی

شعور کے ایک ایک نشیب و فراز کا پتہ لگایا جائے، محکوم کے دل و دماغ تک پہنچے بغیر حکمرانوں کی کوئی ساحری کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یورپین ممالک نے سب سے پہلے اپنی یونیورسٹیوں اور اداروں کی طرف دیکھا اور ہمت افزا جواب پایا۔ سترہویں صدی میں کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا، اور اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے، آکسفورڈ کے عربی پروفیسر ایڈورڈ پوکاک (Edward Pocock) نے حلب سے عربی مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے حاصل کیے، اور "انجیر" کے ایک درخت کے سایے میں جو وہ شام سے لایا تھا، (اور جو اب تک وہاں موجود ہے) عربی تصانیف کے خلاصے کرنے شروع کر دیے، تاکہ مسلمانوں کے ملّی مزاج اور علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ جارج سیل (George Sale) نے اسی زمانے میں قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ یورپی زبانوں میں قرآن کا یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا۔ استشراق کی یہ لہر جو مقتضیات سیاسی نے تیز کر دی تھی، یورپ میں اس طرح پھیلی کہ ہر ملک مسلمانوں کی زبان، تاریخ اور مذہب کی تحقیق میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ جرمنی میں ریسکے (م ۱۷۷۴ء) (Reiske)، سوئٹزرلینڈ میں بورہرڈ (م ۱۸۱۷ء) (Burhard)، فرانس میں سلویستر دی ساسی (Sylvestrede Sacy)، ہالینڈ میں ڈوزی (Dozy)، انگلستان میں رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) نے تو مسلمان بن کر شام اور حجاز کا سفر کیا، پیرس، میڈرڈ، برلن، لندن، لائڈن، آکسفورڈ کے علوم مشرقی کے شعبوں میں اسلام پر تحقیقی کام میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہونے لگا۔ نپولین نے ۱۷۹۸ء کے بعد مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کر دیا، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے نادر قلمی نسخے لندن پہنچا دیے۔ انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، مصر، شام، عراق کے کتنے ہی "انمول موتی" جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقولِ اقبال "دل سی پارہ" ہوتا ہے، یورپین کتب خانوں کی زینت بن گئے۔ نپولین نے وقت کے اشاروں کو سمجھا اور ازہر کے ساٹھ علماء کے سامنے اسلام سے اپنے احترام کا اعلان کیا، اور اپنے نائب کلیبر (Kleber) کو ہدایت کی کہ حکومت کے معاملات میں مسلمانوں کے مذہبی طبقوں کا تعاون حاصل کرے۔[۵] یہ سب سیاست کے تقاضے تھے، جن کا اظہار آکسفورڈ سے لے کر ازہر تک مسلسل ہو رہا تھا۔

اس زمانہ میں صلیبی دور کا کھلا ہوا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا، لیکن مقصد کے نشتر تیز تر ہو گئے، اب ساری جدوجہد کا رخ اس طرف تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے ایسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ میں ہدایت و رہبری کے لیے مغرب کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوں۔ تشکیک اور شبہات کے ذریعے ان کے قوائے ذہنی کو اس طرح مفلوج کر دیا جائے کہ وہ نہ صحیح سمت قدم اٹھا سکیں اور نہ صحیح زاویۂ نگاہ سے چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ پوست پلائے ہوئے انسان کی طرح نہ اعضائے جسمانی ان کے قابو میں ہوں، اور نہ قوائے ذہنی پر ان کا بس چلے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے متعلق مستشرقین کے کام کے دو پہلو خاص طور پر جاذب توجہ نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے والے بہت سے مصنفین فوج سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً ریورٹی (Raverty)، برگس (Briggs)، اسکاٹ (Scott)، ڈاؤ (Dow)، ڈیوی (Devy) - دوسرے یہ کہ سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی وہ شگفتگی برقرار نہ رہ سکے، جو صدیوں تک ان کی سماجی زندگی کی خصوصیت رہی تھی۔ سر ہنری ایلیٹ نے یہ کام آٹھ ضخیم جلدوں میں انجام دیا، ہمیں ایلیٹ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک عرضداشت (Memorandum) میں انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس عرضداشت کو بعد میں کتاب کا جزو بنا کر شائع کر دیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دستاویز ہے جو ان کے مفسدانہ مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مصر کے متعلق یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نپولین کے بیشتر مددگار اور ترجمان فرانس کے مشہور مستشرق سلوسٹر دی ساسی کے شاگرد رشید تھے، اور جب دی لیسپس (Declessaps) نے نہر سوئز کو جاری کیا تھا، تو اس کے عزائم کو کامیاب بنانے میں کتنے ہی فرانسیسی مستشرقین کی بے تاب تمنائیں کام کر رہی تھیں۔

اس دور کے مستشرقین نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام و دہن کو تو تلخی محسوس نہیں ہوئی، لیکن زہر رگ و پے میں اتر گیا۔

چوتھا دور

جب نوآبادیاتی نظام کا دم واپسیں شروع ہوا اور اسلامی ممالک میں آزادی کی تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو مستشرقین کے انداز تحقیق اور طریقہ کار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی۔ نوآبادیوں کی آزادی کو ٹالنا اب ممکن نہیں رہا تھا، لیکن ان سے بے تعلق ہو جانا ملک کے سیاسی اقتدار پر ضرب کاری کے مترادف تھا، چنانچہ اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لیے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہو گیا۔ دولت برطانیہ نے اپنی نوآبادیوں سے دستبردار ہونے میں پس و پیش نہیں کیا، لیکن تمدنی سرمایہ کو (جو آج بھی کتابوں اور آثار کی شکل میں انگلستان کی زینت بنا ہوا ہے۔) واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس دور کے مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں میں رنگِ احترام آ گیا۔ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر میسی نیون سے کہا کہ مغرب کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے، اور اسلام کی صداقت اور حقیقت ان پر آشکار اور واضح ہوتی جا رہی ہے، تو میسی نیون نے ان کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا۔[۶] حقیقت یہ ہے کہ فکر کی یہ تبدیلی مقصد بدل جانے کا نتیجہ تھی، اب سیاسی برتری قائم رکھنے

کے لیے ضروری تھا، کہ بظاہر اپنے اندازِ تحقیق میں اسلام کے ساتھ احترام کا برتاؤ کیا جائے، مبادا کہ سیاسی آزادی کی تحریکیں مغرب کی ذہنی غلامی سے بغاوت کا رنگ اختیار کر لیں، لیکن دوسری طرف ایسے فتنوں کو خاموشی سے بیدار کر دینے کی جستجو شروع ہو گئی جن سے مسلمان ممالک افتراق اور انتشار کا شکار بنے رہیں اور ملی وحدت کی پرچھائیاں بھی ان کے ذہن پر نہ پڑنے پائیں۔ اس دور کے مستشرقین اپنے ملکوں کی وزارتِ خارجہ کے مشیر بن گئے، اور ان کی تحقیق اگر ایک طرف مغربی حکومتوں کی خارجہ پالیسی کا رخ متعین کرنے لگی، تو دوسری طرف ان علاقوں میں خیالات کی تبدیلی لانے کے لیے وزارتِ خارجہ ان مستشرقین سے مدد لینے لگی۔ جو کام کبھی سپاہیوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا، اب پروفیسروں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں اسکار برا رپورٹ (Scarbrough Report) تیار ہوئی جس کو بجا طور پر (Charter of Modern Orientalism) (استشراقِ جدید کا منشور) کہا جا سکتا ہے۔ اس رپورٹ میں اس بات کا شدید احساس ملتا ہے کہ اگر نئے ابھرتے ہوئے مشرق کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا، تو برطانوی مقاصد بُری طرح متاثر ہوں گے، ان مقاصد کو (World Peace) (امنِ عالم) کا معصوم نام دیا گیا ہے، لیکن سامراجی جذبات افکار کا نیا چولہ بدل کر اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ایچ - اے - آر - گب (H. A. R. Gibb.) نے (Modren Trends in Islam) میں نئے انداز سے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر عالمِ اسلام پر نظر ڈالی ہے۔

پانچواں دور

مستشرقین ابھی اسی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے کہ اسلامی ممالک میں "زرسیال" کے چشمے اُبل پڑے اور دنیا کا مرکزِ ثقل عرب ممالک کی طرف منتقل ہو گیا۔ مستشرقین کے حاشیۂ خیال میں بھی ایسی صورت نہ تھی۔ اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی کے خیال نے ان کی استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ نئی صورتِ حال کے امکانات ان کے لیے نہ صرف تشویش بلکہ توحش کا باعث بن گئے۔ اقتصادی اعتبار سے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش برابر جاری ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ قرونِ اولیٰ کے اسلام کے مطالعہ سے بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ اب مستشرقین کی دلچسپی جدید مذہبی تحریکات، سماجی رجحانات اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے، اور فکرِ اسلامی کی توجیہ اور تعلیل سے زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے تجزیے کی طرف توجہ ہے۔ قومیت (Nationalism) کے وہ عناصر جو عربوں کی وحدتِ ملی کے تصوّرات کو پارہ پارہ کر سکتے ہیں، اب توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صیہونیت

نے مستشرقین کے اندازِ تحقیق سے خاموش ساز باز کر لیا ہے۔

شاید تاریخ کے کسی دور میں دیارِ مغرب کے رہنے والوں کو اسلام سے وہ دلچسپی نہ پیدا ہوئی ہو جو عصرِ حاضر کا خاصہ بن کر سامنے آئی ہے۔ حالات کی اس نئی کروٹ نے مستشرقین کو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کا ترکش خالی ہے اور حالات کچھ اور ہی رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس زمانہ میں مستشرقین نے جو کام اسلام پر کیے ہیں، وہ اسلام سے زیادہ خود ان کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں۔ Area Studies کے تصوّر کو اقتصادیات، سیاست ارضی (Geo-politics) اور عمرانیات (Sociology) سے قریب لا کر دینی عناصر کے مطالعہ سے گریز کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں امریکہ میں The Middle East Association Of North America Studies قائم ہوئی اور ۱۹۷۶ء میں British Society For Middle - Eastern Studies کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمنیں بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی مطبوعات اور رسائل سے ان ذہنی خلشوں کا اندازہ ہو جاتا ہے جن سے مستشرقین اس وقت دوچار ہیں۔ کبھی John Westerbury کی Islam and Colonialism: The Hydro - politics of the Nile Valley کی طرف اُن کی نظر جاتی ہے، کبھی Rudolph Peters، Morton Doctrine of Jihad in Modern History پر غور کرتے ہیں، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں۔ کہ اسلامی فکر کا دھارا اب کس رخ بہے گا، اور انھیں کہاں کہاں اور کیا کیا بند باندھنے چاہییں۔ ایک جدید ترین کتاب Islam and the West کے مصنف Normon Danial نے مستشرقین کی تصانیف پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ Latin Europe نے اسلام کے خلاف بہت سے غلط نظریات پھیلائے تھے، لیکن اس کی عصبیت اس کو "علمی بد دیانتی" تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

یہ ہیں وہ پانچ دور جن کے زیرِ اثر ان کی علمی کاوشیں وقت اور حالات کا ساتھ دیتی رہیں۔

مقاصد

۱۔ افراد کی زندگی میں جو حیثیت حافظہ کی ہے، قوموں کی زندگی میں وہی اہمیت ان کی تاریخ کی ہے۔ مستشرقین کے پیشِ نظر سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیاتِ اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے، تاکہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصوّر کریں تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہو سکے، بقول مولانا شبلی[۸]

ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے، کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر

لیا ہے، بلکہ یہ رونا بھی ہے، کہ ہمارے مُردوں پر یورپ کے مُردوں نے فتح پالی ہے۔

اس مقصد کے پیشِ نظر مسلمانوں کو علمی اعتبار سے ایسے احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی فکر کے سوتے خشک ہوجائیں، ان کی خودی ختم ہو تو ان کی گردنوں میں برگسان اور ہیگل سے عقیدت کی زنار ڈالی جائے۔

۲۔ ایک ایسے دور میں جب کہ اسلامی ممالک میں معرکۂ سائنس و مذہب برپا تھا، اور سائنس کی ایجادات نے ایک ذہنی خلش پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی جہد و سعی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ مسلمان سائنس کی برتری تسلیم کر کے اپنے مذہب سے بیزار ہوجائیں، ان کو اپنا قانون، اپنی شریعت، اپنا طرزِ زندگی، سب فرسودہ اور بیکار نظر آنے لگے، مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی اور اصلاح کا آوازہ سب سے پہلے مستشرقین ہی نے بلند کیا تھا۔ یورپ میں سائنس اور مذہب کا معرکہ جلدی شروع ہوا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔ مستشرقین نے مشرق میں اس جنگ کو طول دے دیا، تاکہ مسلمانوں کو قدم قدم پر اپنے مذہب کے ناقص ہونے کا احساس ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اسلام اس معرکہ میں ناکام ہوچکا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کے ذہن کو ایسے مسائل میں الجھایا جائے جن کا ان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن جو قوائے ذہنی کو مضمحل کرنے میں کارگر ثابت ہوں، اقبال کی نظم میں ابلیس کا جو مشیر مسلمانوں کو ان گتھیوں کے سلجھانے کی تلقین کرتا ہے۔[۹]

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اس کے پہلو میں مستشرق ہی کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔

۴۔ اسلامی تاریخ کے ایسے گوشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر زیرِ بحث لایا جائے، جو مسلمانوں میں اتحادِ ملّی کے جذبات کو نشوونما پانے سے روک دیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر مستشرقین نے کتنی ہی عداوتوں کو جو وقت کے ساتھ بے جان ہوچکی تھیں، نئی زندگی بخش دی۔

(جاری ہے)